علامہ اقبال کا تصورِ خلافت

اداریہ / انجینئر مختار فاروقی

الحمدللہ کہ قرآن آڈیٹوریم جھنگ میں یومِ اقبال کے موقع پر عالم اسلام کے ایک گھمبیر اور زندہ مسئلہ کے موضوع پر سیمینار منعقد ہوا۔ یہ مسئلہ ایسا سادہ اور آسان نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ کو اُمت کے بہی خواہوں اور دانشوروں کی طرف سے مسلسل خونِ جگر سے آبیاری کی ضرورت ہے۔

ذیل میں ترتیب سے چند نکات دیے گئے ہیں جو اُمت کے ذہین عناصر اور بہی خواہوں کو ہر دم پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے تا کہ اس حوالے سے قدم آگے بڑھائے جاسکیں۔

☆ علامہ اقبال نے اپنے فارسی کلام میں خلافت کے موضوع پر اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک اس تصورِ خلافت کو سلطنت عثمانیہ یا عثمانی خلافت کے زوال (28 رجب 1342ھ بمطابق 3 مارچ 1924ء) سے نتھی نہیں کرنا چاہیے۔

☆ علامہ اقبال کے نزدیک محکماتِ قرآنیہ میں سے توحید، حکومتِ الٰہی اور خلافتِ آدم کا تصور ہے اس کے لیے حکمت قرآنی کا دامن تھامنا ضروری ہے اور مغربی خدا بیزار اور بے خدا علم اور سائنس سے پیچھا چھڑانا ضروری ہے۔

علامہ اقبال نے آدم علیہ السلام کی خلافت کا تذکرہ فرمایا ہے گویا انسان کا حقیقی اور اعلیٰ مقام۔ عبدیت کے ساتھ احکامِ الٰہی (عدلِ اجتماعی) کی تنفیذ ہے۔ اسی لیے حضرت داؤد علیہ السلام جو 40 سال تک بادشاہ رہے، انہیں خلیفہ کہا گیا۔

☆ علامہ اقبال اپنے تصورِ خلافت کے لیے حدیث سے استدلال فرماتے ہیں۔ اس حدیث کا متن یوں ہے:

تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا ، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ فَتَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَااِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعُهَا ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا فَتَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَااِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعُهَا ، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيًّا فَتَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنُ ثُمَّ يَرْفَعُهَااِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعُهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ ثُمَّ سَكَتَ (احمد عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ)

''تمہارے اندر عہد نبوت جب تک اللہ چاہے گا موجود رہے گا پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اس (عہد نبوت) کو ختم کر دے گا، اس کے بعد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی جو قائم رہے گی جب تک اللہ چاہے گا پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا پھر (اس کی جگہ) کاٹ کھانے والی بادشاہت قائم ہوگی جو جب تک اللہ چاہے گا برقرار رہے گی پھر اسے بھی جب اللہ ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا پھر جابرانہ ملوکیت کا دور ہوگا جو جب تک اللہ چاہے گا باقی رہے گا پھر اللہ جب اسے بھی ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (دوبارہ) قائم ہوگی۔ پھر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔

☆ علامہ اقبال نے اپنے مشہور لیکچر میں اسی تصور کو نمایاں کیا ہے کہ حاکمیت اللہ کی ہے، **اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ** SOVEREIGNTY BELONGS TO ALLAH VICEGERENCY یعنی خلافت انسان کے لیے ہے۔

☆ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا کہ خلافت کے بعد کچھ عرصے میں حکومتی سطح پر ملوکیت آ گئی ''**مُلْكًا عَاضًّا**'' جو تقریباً بارہ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے اس کے بعد غلامی کا دور ''**مُلْكًا جَبْرِيًّا**'' آ گیا، مسلمان یورپی اقوام کے غلام بن گئے، عین دورِ غلامی کے وسط میں علامہ اقبال نے دورِ غلامی کے بعد آنے والے تاریخ انسانی کے حسین مستقبل یعنی دوبارہ دورِ خلافت۔ (جسے عرفِ عام میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا نام دیا گیا ہے) کی نوید سنائی ہے۔ 1913ء کے جوابِ شکوہ میں:

وقت فرصت ہے کہاں ، کام ابھی باقی ہے

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے
؎ عقل ہے تیری سپر ، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش ! خلافت ہے جہانگیر تری
؎ کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

☆ علامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں اسی عالمی خلافت کے قیام کے لیے ایک ROADMAP دیا اور اسی کے مطابق 1930ء میں خطبہ الٰہ آباد میں پاکستان کے قیام کی تجویز دی کہ: اسلام کے نظام عدلِ اجتماعی میں دورِ ملوکیت پر (مُلْکًا عَاضًّا اور مُلْکًا جَبْرِیًّا کے دور میں) جو پردے پڑ گئے تھے، اگر برطانوی ہند کے شمالی مغربی حصے میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو ہم دورِ ملوکیت کے ان اثرات کو ہٹا کر دوبارہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور لے آئیں گے۔

☆ یہ بات حدیث پاک کی ہے اور تقدیر مبرم ہے۔ علامہ اقبال نے اس کے لیے BESTINY کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس حدیث کے مطابق پہلے کسی ایک ملک میں (غالباً پاکستان میں) اور بعد ازاں عالمی سطح پر خلافت کے قیام کے خاکے اور BLUE PRINT کو اقبال کا تصورِ خلافت کہا گیا ہے۔

☆ اسی تصور کے تحت قیام پاکستان تجویز ہوا اور قائداعظمؒ کی زیر قیادت جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے اس مقدس خواب کی تعبیر رقم کر کے مخالف حالات کے باوصف پاکستان کا قیام ممکن بنا دیا۔

☆ علامہ اقبال کے تصورِ خلافت کے مطابق اب پاکستان کے موجودہ حالات کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق VICEGERENCY میں بدلنا آج کا تقاضا ہے اس میں اہل دین اور رجال دین کو حدیث پاک کی روشنی میں قابل عمل تجاویز کے ساتھ آگے آنا چاہیے۔

☆ علامہ اقبال کے تصورِ خلافت کے مطابق اب رجالِ دین (علماء قرآن وحدیث) کو عصری علوم حاصل کر کے ایک شورائی فورم (مجلس شوریٰ یا اسمبلی یا قانون ساز ادارہ) میں آنا چاہیے تاکہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق قانون سازی ہو سکے۔ اب انفرادی فتویٰ نویسی کا دور نہیں بلکہ عملاً قانون ساز ادارے میں آ کر ملک کے اسلامی تعلیمات کے عصری تقاضوں کے مطابق قانون سازی کرنے کا ہے۔

☆ اس مقصد کے لیے قیام نظام خلافت کے لیے مجوّزہ شورائی اور قانون ساز فورم کے لیے ممبران کی تعلیمی لیاقت کو L.L.M یا قانونِ اسلامی اور LEGISLATURE میں Ph.D تک اونچا کیا جاسکتا ہے۔ (اسی طرح ووٹر کے معیار کو بھی نظر ثانی کر کے B.A اور شادی شدہ ہونے کے ساتھ مشروط کیا جاسکتا ہے) تاکہ ملک میں مغربی تہذیب TRENDS کے برعکس حصولِ علم اور متاہل زندگی گزارنے کا مثبت TREND پروان چڑھے اور گناہوں سے پاک معاشرہ وجود میں آئے جس کو مزید قانون سازی کے ذریعے ایک روحانی، مثالی اور مصطفائی (ﷺ) معیار تک اٹھایا جاسکے۔

☆ یہ کام شُدنی اور اٹل ہے علماء کرام اور مسلم دانشور طبقہ کو کمر کس کر آگے بڑھنا چاہیے اور علامہ اقبال کے ROAD MAP کے مطابق قیام پاکستان کے خاکے میں رنگ بھرنے چاہئیں۔

☆ علامہ اقبال کے دیے گئے ROAD MAP کے مطابق 1930ء کے بعد پہلے پاکستان 1947ء میں آزاد ہوا اور اب تک 60 کے قریب مسلمان ممالک آزاد ہیں اور مغربی صیہونی استعمار کے منحوس اثرات کے چنگل سے نکلنے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ وقت اُمت کے بہی خواہوں، قرآن وحدیث کے متوالوں، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے عاشقوں اور نظام خلافت کے شیدائیوں کے لیے آگے بڑھنے اور کام کا وقت ہے۔ صرف باتوں سے نہیں مفکر پاکستان حکیم الامت علامہ اقبال کی نظری فکری رہنمائی کے ROAD MAP کے مطابق آگے بڑھنا ضروری ہے۔

☆ علامہ اقبال اپنے خطبات میں اپنی ساری تجاویز کو حتمی اور حرفِ آخر نہیں سمجھتے تاہم ان کی روشنی میں آج کے تقاضوں کے مطابق غور کر کے خلافت علی منہاج النبوۃ کا نظام عملاً قائم کر دینا اصل مقصود ہے تاکہ انسانیت سیدنا محمد ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کی ٹھنڈی چھاؤں میں خداشناسی اور خودشناسی کے جذبات کو پروان چڑھا کر دنیا و آخرت میں کامیاب ہو سکے۔ یہ جدوجہد آج ہر مسلمان پر قرض اور فرض ہے۔ بقول اقبال:

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں رافاش کن نکتہ شرعِ مبیں رافاش کن
کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

اہم اعلان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترم قارئین کرام! آپ احباب کو انتہائی مسرت کے ساتھ خوش خبری دی جاتی ہے کہ تحریک کے امیر ڈاکٹر نجم الدین صاحب کی تحریر کردہ تفسیر و ترجمہ ''البرہان القرآن'' اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے چھپ چکا ہے اور تحریک کے دفتر بمقام B4 / 29 'واپڈا ٹاؤن' لاہور میں موجود ہے جو حضرات خریدنا چاہیں وہ رابطہ کریں۔ شکریہ!

رابطہ نمبران: 0300 - 8425428 ،0301 - 7339377

یہ تھا نظامِ مصطفیٰ ﷺ!

..... پرویز چودھری

عالمِ انسانیت کی جس عظیم ترین ہستی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے ذکر کو ہم آج اپنے لئے سرمایۂ سعادت اور توشۂ آخرت سمجھتے ہیں اس کے تذکارِ جلیلہ کی عالمگیریت کے متعلق علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ اسے:

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں دیکھ
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں دیکھ
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں دیکھ
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں دیکھ
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

حضور نبی اکرم ﷺ کی شان میں رفعنا لک ذکرک خود ارشادِ الٰہی ہے۔ یعنی باری تعالیٰ نے کہا تھا کہ اے رسول ﷺ ہم تمہاری رفعتِ شان کے تذکرہ کو انتہائی بلندیوں اور وسعتوں تک پہنچا دیں گے۔ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں اپنے تو ایک طرف، غیروں تک نے جن شاندار الفاظ میں ہدیۂ تحسین و تبریک پیش کیا ہے اسے یکجا کیا

جائے تو اس سے ضخیم مجلدات مرتب ہو جائیں۔ لیکن میں اپنی آج کی تحریر کا آغاز ایک ایسے اعتراف سے کرنا چاہتا ہوں جو تازہ ترین بھی ہے اور عظیم ترین بھی۔ حال ہی میں امریکہ سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو غالباً پاکستان میں نہیں پہنچی۔ کتاب کا نام ہے ''تاریخ کی ایک سو عظیم ترین شخصیتیں'' اور اس کا مؤلف ہے H. Hart جو افلاکیات اور تاریخ کا عالم ہے۔ اس میں اس نے تاریخِ انسانیت (یعنی کسی خاص قوم، خاص ملک یا خاص زمانہ کی نہیں، بلکہ پورے کے پورے عالمِ انسانیت کی تاریخ) کی ایسی ایک سو شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے معیار کی رو سے عظیم ترین اور عدیم النظیر ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس فہرست میں سب سے اوپر (پہلے نمبر پر) کس شخصیت کا نام نامی ہے؟ اس ذاتِ گرامی کا جسے خالقِ کائنات نے رحمت اللعالمین ﷺ کہہ کر پکارا اور جس کی شان میں رفعنا لک ذکرک ارشاد فرمایا۔ ہارٹ نے کہا کہ میں نے اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کا اسمِ گرامی اس لئے سرفہرست رکھا ہے کہ:

''اس نے لکھا ہے کہ اس فہرست کے مرتب کرنے میں میں نے کسی شخصیت کے انفرادی کردار کو معیار نہیں قرار دیا۔ معیار یہ پیشِ نظر رکھا ہے کہ اس نے پوری تاریخ اور دیگر انسانوں کو کس حد تک متاثر کیا اور اس معیار کی رو سے مجھے محمد ﷺ بلند ترین سطح پر فائز نظر آتے ہیں۔ ہارٹ نے حضور نبی اکرم ﷺ کی عدیم النظیر کامیابی کا سلسلہ میں مذہب اور امورِ دنیا کا الگ الگ ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان کے ہاں یہ دونوں شعبے الگ الگ ہیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن حضور ﷺ نے اقدارِ الٰہی کے مطابق ایک ایسا نظام قائم کیا تھا جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو محیط تھا اور جس کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔

رسول کی بعثت کا مقصد:

ہمارے ہاں چونکہ اسلام، دین کے بجائے مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے اس لیے رسول کی بعثت کا مقصد وعظ و نصیحت یا نماز روزہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب جو ''نظامِ مصطفیٰ ﷺ'' کی اصطلاح عام ہوئی ہے تو اس میں بھی اس نظام کا کوئی واضح نقشہ سامنے نہیں لایا گیا۔ بات نماز، روزہ یا تعزیرات تک ہی محدود رکھی جاتی ہے۔ ایک رسول کی بعثت کا مقصد کیا ہوتا تھا اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا ہے کہ:

''رسول اس لیے آتا ہے (یعنی آتا تھا) کہ زمانے کے طوفانوں پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ (مضرابِ وحی سے) اس کے نفسِ قدسی میں ایسی ولولہ انگیز قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیائے انسانیت میں انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے (وحی کی روشنی میں) دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس لیے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آ گئی ہے وہ کس انداز کی ہے''۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب تفہیماتِ الٰہیہ میں لکھتے ہیں:

''چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں دنیا توحید کو فراموش کر چکی تھی اس لیے اس زمانے میں توحید کی اشاعت اور طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ذکر کی عبادتیں جاری کرنے کے احکام نازل ہوئے۔ مگر چونکہ ہمارے نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی اور معاشرتی فسادات پیدا ہو چکے تھے اور ان کی اقتصادی زندگی سخت خراب ہو چکی تھی اس لیے حضور ﷺ کو ان خرابیوں کے استیصال کیلئے مبعوث فرمایا اور آپ ﷺ کے ہاتھوں رومی اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کر دیا۔ جو ان خرابیوں کا سرچشمہ تھیں''۔ (جلد اول: ص:66)

ہم شاہ صاحب کے اس خیال سے کلیۃً متفق نہیں۔ دین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا ہے اس لیے ہر رسول کی بعثت کا بنیادی مقصد ایک ہی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی رسول کے زمانے میں جو خرابی سب سے زیادہ فساد انگیز ہوتی تھی وہ اس کے استیصال کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ قرآنِ کریم شاہد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بھی ملک عظیم عطا ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ مملکت کے فرائض اور ذمہ داریاں نماز، روزہ تک محدود نہیں ہوتیں اگرچہ یہ بھی اس کے نظام کے اہم ستون ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ کی مکی زندگی:

بعض کوتاہ بینوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جب تک حضور اکرم ﷺ مکہ میں رہے، اسلام کو وعظ و نصیحت تک محدود رکھا لیکن جب مدینہ میں مملکت حاصل ہوئی تو

سیاسی، معاشرتی، معاشی شعبوں کو مذہب کے دائرہ میں لے آیا گیا۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ نبوت کے آغاز ہی سے حضورﷺ کے پیشِ نظر مملکت کا نظام تھا۔ مکی زندگی اس مقصد کے حصول کی تیاری کا زمانہ تھا کیونکہ قرآنِ کریم نے واضح کر دیا تھا کہ اسلامی مملکت، ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ تاریخ الکامل ابن اثیر میں ہے کہ حضورﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں خود اپنے اہلِ خاندان کے نام جو پیغامات بھیجے، ان میں ایک پیغام میں فرمایا:

''یاد رکھو! تمہاری قوم میں آج تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس نصب العین سے بہتر نصب العین رکھا ہو جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لیے آیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے حکومتِ الٰہی کے امور سرانجام دینے کیلئے وزراء کی ضرورت ہوگی۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے؟

مقصدِ رسالت:

اس ضمن میں تاریخ الکامل ہی کا ایک اور واقعہ مذکور ہے۔ لکھا ہے:

''شداد بن اوس کا بیان ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ دربارِ نبوی میں حاضر تھے کہ قبیلہ عامر کا ایک معزز اور بزرگ سردار اپنا عصا ٹیکتے اس حلقہ میں پہنچا۔ اس نے حضورﷺ کی دعوت سے متعلق بہت سے سوالات کیے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ ''دعویٰ کا کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے۔ آپﷺ کے دعویٰ کی صداقت کا ٹھوس ثبوت کیا ہے''۔ آپﷺ نے فرمایا کہ ''میں اپنے باپ ابراہیمؑ اور بھائی عیسیٰؑ کی ذمہ داریوں، بشارتوں اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں''۔ عامری نے یہ سن کر کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کر دوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپﷺ نے فرمایا، جنت کے باغات۔ اس نے کہا یہ تو آخرت کی بات ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے دنیا میں کیا حاصل ہوگا۔ آپﷺ نے فرمایا: خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔ اس سے واضح ہے کہ آغازِ نبوت ہی سے حضور اکرمﷺ کے پیشِ نظر ایک مملکت کا حصول تھا جس میں ایسا نظام قائم کیا جا سکے جس کی نظیر کہیں نہ ملتی ہو۔ یہی مقصودِ رسالت تھا۔

یہ تو میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اس مختصر سے وقت میں اس نظام (نظامِ خلافتِ راشدہ) کے تمام گوشوں کو آپ کے سامنے لاسکوں۔ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ اس کے دو ایک اہم پہلوؤں کی خفیف سی جھلک آپ کو دکھا دوں۔ علامہ اقبالؒ نے اس نظام (یعنی دینِ الٰہی) کے ماحصل کو ایک شعر میں اس جامعیت سے سمو دیا ہے کہ اس پر غور کرنے سے بصیرت وجد میں آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

میں مختصر الفاظ میں یہ عرض کروں گا کہ اس نظام نے حاکم و محکوم کا فرق کس طرح مٹایا اور سائل و محروم کا وجود کس طرح ختم کیا۔ قبل اس کے کہ میں ان فردوس بداماں مناظر کو آپ کے سامنے پیش کروں، یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نظام کا آغاز حضور رسالت مآبﷺ کے دستِ مبارک سے ہوا تھا لیکن (اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق) اس کی تکمیل خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوئی تھی۔ چنانچہ حضورﷺ کی وفات کے بعد مکہ میں حضرت سہیلؓ بن عمر کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ:

''اللہ کی قسم! اسلام کا مقصد تکمیل تک پہنچے گا۔ میں نے حضورﷺ کی زبان مبارک سے یہ سنا ہے کہ (آپﷺ نے فرمایا تھا) لوگو! میرے ساتھ لا الہ الا اللہ کہو، عرب تمہارے تابع فرماں ہوں گے، عجم باجگذار۔ اللہ کی قسم تم قیصر و کسریٰ کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے''۔ (تاریخ الکامل)

اس دعویٰ کی تکمیل خلفائے راشدین کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ بالخصوص حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے زمانے میں۔ لہٰذا میں جو مثالیں آپ کے سامنے پیش کروں گا ان کا تعلق محمد رسول اللہﷺ کے عہد سعادتِ مہد ہی سے نہیں، بلکہ (قرآن کے الفاظ میں) والذین معہ کے زمانے سے بھی ہوگا۔ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اس نظام کی تکمیل اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق صدرِ اول میں ہوئی تھی۔ یہ اس لیے کہ قرآنِ کریم تو تمام نوعِ انسان کیلئے قیامت تک ضابطۂ نظام ہے۔ جن اصول و اقدار کے مطابق یہ نظام متشکل ہوگا وہ تو ہمیشہ کیلئے غیر متبدل رہیں گے لیکن اس کی جزئیات اور طرق و اسالیب مرورِ زمانہ کے ساتھ عند الضرورت بدلتے جائیں گے۔ لہٰذا جوں جوں انسانی

زندگی کے تقاضے وسیع ہوتے جائیں گے' یہ نظام بھی اس کے مطابق وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآنی راہنمائی حدود فراموش ہے' اسی طرح اس کی روشنی میں قائم کردہ نظام بھی قیود نا آشنا ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ!

نہ حاکم نہ محکوم:

اب میں اس نظام کے پہلے گوشے کی طرف آتا ہوں۔ یعنی اس امر کی وضاحت کی طرف کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہوگا' نہ محکوم۔ انسانی نظامِ مملکت میں (خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو) یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ جب حکومت قائم ہوگی تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ حاکم اور محکوم کے بغیر تو حکومت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن انسانی نظام اور الٰہی نظام میں یہ بنیادی فرق ہے۔ نظام الٰہی میں اطاعت نہ کسی فرد کی ہوتی ہے نہ افراد کے کسی گروہ کی۔ اس میں اطاعت قوانین کی ہوتی ہے اور قوانین ایسے کہ جو انسانوں کے وضع کردہ نہ ہوں بلکہ خود اللہ کے نازل فرمودہ ہوں۔ ان قوانین کا اطلاق' مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہوگا' اور جسے ہم حکومت کہتے ہیں اس کا فریضہ ان قوانین کو نافذ کرنا ہوگا۔ ان قوانین کی اطاعت میں بھی کسی قسم کا جبر نہیں ہوگا۔ اسے تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو ان کی فرماں روائی کو بطیب خاطر قبول کرلیں ان پر اطلاق ہوگا۔ انہی کو امتِ مسلمہ یا جماعت مومنین کہا جائے گا۔ ان قوانین کی دوسری خصوصیت یہ ہوگی کہ ان میں کوئی تغیر و تبدل یا حکم و اضافہ نہیں ہو سکے گا ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس نظام میں نہ صرف یہ کہ کوئی حاکم یا محکوم نہیں ہوگا بلکہ افرادِ معاشرہ کو اس کا کلی اطمینان ہوگا کہ جن قوانین کی اطاعت انہوں نے بطیب خاطر اختیار کی ہے ان میں کبھی ردوبدل نہیں ہوگا۔

فرماں روائی صرف قانون کی:

جہاں تک محکومیت کا تعلق ہے' تاریخ انسانیت اس پر شاہد ہے کہ سیاسی محکومیت کے مقابلہ میں' مذہبی پیشواؤں کی محکومیت زیادہ متشدد اور سخت گیر ہوتی ہے۔ اس نظام میں جہاں سیاسی محکومیت کو ختم کیا گیا' وہاں مذہبی پیشوائیت کے اقتدار ہی کو نہیں' اس کے وجود تک کو معدوم کر دیا گیا۔ قرآنِ کریم نے یہود و نصاریٰ کے متعلق کہا ہے کہ: ''انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ سے ورے ہی الٰہ بنا رکھا ہے'' (9:31)۔ اس آیت کی تفسیر میں حضور نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی نہایت واضح اور تابناک ہے:

حضرت عدیؓ بن حاتم سے مروی ہے کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائی تھا اور میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی۔ حضور ﷺ نے دیکھ کر فرمایا: ''عدی اس بت کو گلے سے اتار پھینک''۔ اس وقت آپ ﷺ سورہ برأۃ (توبہ) تلاوت فرما رہے تھے۔ جب یہ آیت آئی ''اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ'' (9:31)۔ تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے ان لوگوں کو کبھی رب نہیں بنایا۔ فرمایا! مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ اللہ نے جو چیز حرام کی ہے اسے یہ لوگ تمہارے لیے حلال کر دیتے ہیں اور تم حلال سمجھنے لگتے ہو اور اللہ نے جو چیز حلال قرار دی ہے اسے یہ لوگ حرام کر دیتے ہیں اور تم حرام سمجھنے لگتے ہو۔ میں نے اقرار کیا! بیشک واقعہ یہی ہے تو فرمایا یہی تو انہیں الٰہ بنا دیتا ہے۔ (جامع بیان العلم' ابن عبدالبر)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المومنینؓ! جب ہم نے مدائن فتح کیا تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں بڑی اچھی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ آپؓ نے فرمایا: کیا قرآن سے بھی زیادہ اچھی؟ اس پر اس نے کہا کہ نہیں۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ ''یاد رکھو! تم سے پہلی امتیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے علماء اور مشائخ کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتابوں کو چھوڑ دیا..... نتیجہ اس کا یہ کہ اللہ کی کتابیں مٹ گئیں اور اس طرح دین ان کے ہاں سے ضائع ہو گیا۔ تم ایسا نہ کرنا''۔ (شاہکارِ رسالت' ص:72)

یوں اس نظام نے مذہبی پیشواؤں کے وجود کو ختم کر دیا۔ اس میں قانونِ الٰہی کا نفاذ بھی مملکت کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تشریح و تعبیر کا فریضہ بھی مملکت ہی ادا کرتی تھی۔ اس نظام کی اولیں مرکزی اتھارٹی' حضور نبی اکرم ﷺ کو ارشاد تھا کہ: ''ان کے معاملات کے فیصلے قرآنِ مجید کے مطابق کرو'' (5:48)۔ حضور نبی اکرم ﷺ

نے اس کتابِ الٰہی کے مطابق سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم کی۔عمر بھر اسی کے مطابق فیصلے فرماتے رہے اور دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے حجۃ الوداع کے خطبہ میں پوری امت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہ ہوگے.....وہ ہے کتاب اللہ'' (بخاری' باب حجۃ الوداع)۔

حضور اکرم ﷺ کے بعد' آپ ﷺ کے سچے جانشین اپنے زمانے میں اس مسلک پر قائم رہے کیونکہ یہ ارشادِ الٰہی ان کے سامنے تھا کہ:

''جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں'' (المائدہ:44)۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں اپنے لیے دعا یہ مانگی تھی کہ:

''یا اللہ! مجھے تفکر و تدبر قرآنی عطا فرما تا کہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔اور سامعین سے کہا تھا کہ: قرآن پڑھا کرو۔اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی اور اس پر عمل کرو تا کہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ'' (شاہکارِ رسالت' ص:66)۔

وہ امورِ مملکت میں اپنے مشیروں سے مشورہ لیتے تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے کہ ''میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری بات مانیں۔آپ لوگوں کے پاس کتاب اللہ ہے جو حق کو صاف صاف بیان کرتی ہے آپ اس کے مطابق مشورہ دیں''۔

آپؓ کے عہد میں عمالِ حکومت کے انتخاب کا اولیں معیار یہ تھا کہ وہ کس حد تک قرآن میں تفقہ کر سکتے تھے۔جب مکہ کے گورنر نافع بن عمرؓ بن عبدالحارث نے عبدالرحمانؓ بن ابزی کو وادی کا والی مقرر کیا تو حضرت عمرؓ نے اس (گورنر) سے پوچھا کہ اس انتخاب کی بنیاد کیا ہے؟ اس پر اس نے کہا کہ وہ شخص قرآن مجید میں تفقہ کرتا ہے اور دین کے فرائض کا علم رکھتا ہے۔تو آپؓ بہت خوش ہوئے۔قرآنِ کریم کی اہمیت و عظمت آپ کے رگ و پے میں اس حد تک سرائیت کیے ہوئے تھی کہ جب آپؓ کو وہ زخم لگا جس سے آپؓ کی شہادت واقعہ ہوگئی تو کیفیت یہ تھی کہ انتڑیاں کٹ کر باہر آ چکی تھیں۔جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔درد کی شدت انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اس حالت میں صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہوئے اور آپؓ سے کہا کہ آپ اپنی وصیت فرما دیجئے۔تو آپؓ نے ان سے کہا کہ: ''میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کو تھامے رہنا کیونکہ جب تک تم اسے تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہوگے''۔

اس حالت میں ایک شخص آپ کی عیادت کیلئے آیا۔اس نے دیکھا کہ آپ آخرت کے خیال سے مضطرب و بے قرار ہیں اور بار بار اس کا احساس کرتے ہیں کہ جو ذمہ داریاں اللہ نے مجھے سونپی تھیں' معلوم نہیں میں ان سے عہدہ برآہ ہو سکا ہوں یا نہیں۔اس نے کہا کہ آپ اس باب میں متردد نہ ہوں۔جہنم کی آگ آپ کو چھو نہ سکے گی۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔اس سے کہا کہ ''بھائی! تمہارا علم اس بارے میں بہت قلیل ہے۔میرے بس میں ہوتا تو میں زمین کے سارے خزانے اس مؤخذاہ کے خوف سے نچھاور کر دیتا''۔آپ نے یہ الفاظ کہے تو حضرت ابن عباسؓ نے جو آپ کے پاس بیٹھے تھے کہا کہ ''یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ اس لیے کہ آپ ہمیشہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور سب کے حقوق برابر عطا کرتے تھے''۔یہ سن کر آپؓ کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوگئی اور سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا: ابنِ عباسؓ! کیا تم میرے بارے میں اس امر کی شہادت دو گے؟ وہ خاموشی سے سنتے رہے تو آپ نے دوبارہ کہا کہ کہو ابن عباسؓ! تم اس کی شہادت دو گے کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا اور سب کے حصے برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔حضرت ابنِ عباسؓ نے کہا کہ ہاں! میں اس کی گواہی دوں گا۔اس پر آپ کو اطمینان ہوا۔آپ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے' حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے الفاظ میں' اس کی عام گواہی دی کہ: ''عمرؓ.....کتاب اللہ کے سب سے بڑے عالم تھے اور دین کے سب سے بڑے فقیہہ''۔

میں نے ان حضرات (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے تفقہ کا ذکر اس لیے خاص طور پر کیا ہے کہ اسلامی مملکت میں فقہاء اور علماء کا الگ وجود نہیں ہوتا تھا۔سربراہِ مملکت اور عمالِ حکومت ہی فقہاء اور علماء ہوتے تھے۔اس دور میں نہ امت میں الگ الگ فرق تھے' نہ ان کی الگ الگ فقہیں.....ایک امت تھی۔ان کی ایک مرکزی اتھارٹی.....وہی اتھارٹی قرآنی قوانین نافذ کرتی تھی اور وہی ان قوانین کی فقہی تعبیرات کا حق رکھتی تھی۔کسی اور کو ان کی تعبیر اور تشریحات کا حق اور اختیار نہیں تھا' بعینہ جس طرح آج مملکت کے قوانین کی تعبیرات کا حق نمائندگانِ حکومت کے سوا کسی کو نہیں۔چونکہ مملکت کی بنیاد کتاب اللہ پر تھی اسی لئے کتاب اللہ مملکت کے گوشے گوشے تک پھیلی ہوئی تھی۔چنانچہ امام بن حزم کی تحقیق کے مطابق عہدِ فاروقی میں قرآنِ مجید کے کم و بیش ایک لاکھ نسخے مملکت میں پھیلے ہوئے تھے۔قرآنی تعلیم کی اس قدر عام اشاعت کا

نتیجہ تھا کہ امت قرآنی اور غیر قرآنی امور میں خود امتیاز کر سکتی تھی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

''حاکم کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ رعایا ان فرائض کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ ہم تمہیں انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے روکیں گے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے''۔

وحی اور رائے میں فرق:

امورِ مملکت کے فیصلے تو قرآنِ مجید کے اصول، اقدار اور احکام کے مطابق ہوتے تھے جو غیر متبدل تھے لیکن ان کی جزئیات کا تعلق اور ان کے نافذ کرنے کا پروگرام باہمی مشاورت سے طے پاتا تھا۔ اس مشاورت میں بھی اصول یہی کارفرما ہوتا تھا کہ یہ مشورے حدود اللہ کے مطابق ہوں۔ جب عراق کی زمینوں کے متعلق اہم سوال زیرِ بحث آیا تو حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں جو تقریر فرمائی اس میں کہا:

''میں نے آپ حضرات کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ آپ اس امانت کے بارے میں میرا ہاتھ بٹائیں جسے میرے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ میں بھی آپ ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات نے حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے میری مخالفت کی اور بعض نے مدافعت، میں نہیں چاہتا کہ آپ میری بات محض اس لیے مان لیں کہ وہ میری بات ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کتابِ الٰہی ہے جو حق کے ساتھ بات کرتی ہے۔ اگر میں بھی کسی معاملہ میں لب کشائی کرتا ہوں تو حق کیلئے ایسا کرتا ہوں''۔

اس بارے میں آپؓ اپنی رائے اور وحی کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نہ کہہ دیا کہ یہ ''اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے''۔ آپؓ نے اسے فوراً ڈانٹا اور کہا کہ ''تو نے یہ بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا: یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے امت کیلئے سنت نہ بناؤ''۔ عمرؓ کی رائے ہی نہیں۔ کسی ایک اسلامی مملکت کے وضع کردہ قوانین بھی ابدی نہیں ہوتے۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق بعد میں آنے والی اسلامی مملکت تبدیلی کر سکتی ہے۔ اس اہم اصول کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کی رو سے آپ نے فرمایا: ''بے شک اللہ بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کیلئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے''۔ (کتاب المیزان) حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا بنیادی طور پر اس کا تعلق قانون سازی کے اصول سے ہے لیکن بغور دیکھئے تو اس میں وہ عمیق نکتہ بھی پوشیدہ ہے جو دین کی بنیاد ہے یعنی اس میں ساری اہمیت اصولوں کو حاصل ہوتی ہے، شخصیتوں کو نہیں۔ قرآن تو آیا ہی شخصیت پرستی کو مٹانے کیلئے تھا۔

شخصیت پرستی:

''شخصیت پرستی'' سے میری نگاہ بلا ساختہ اس عظیم واقعہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جس کی مثال دنیائے مذاہب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ تاریخِ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ قوموں کی کشتی، شخصیت پرستی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے، خواہ یہ شخصیت پرستی، دنیاوی حکمرانوں کو ''ظل اللہ علی الارض'' (زمین پر اللہ کا سایہ) قرار دینے کی شکل میں ہو، اور خواہ روحانی پیشواؤں کو فوق البشر حیثیت دینے کی صورت میں۔ شخصیت پرستی کی دوسری شکل، پہلی کے مقابلے میں کہیں زیادہ شدید، محکم اور عمیق ہوتی ہے۔ دنیاوی حکمرانوں کی محکومیت کی زنجیریں انسان کے جسم کو مقید کر سکتی ہیں لیکن روحانی پیشوائیت کی محکومیت کا تسلط انسان کے قلب و دماغ اور روح پر ہوتا ہے۔ اگر کسی (زندہ یا مردہ) ''حضرت صاحب'' کی شان کے خلاف خیال تک بھی ان کے کسی معتقد کے دل میں گذر جائے تو وہ ڈرتا ہے۔ کانپتا ہے، لرزتا ہے کہ نہ معلوم اس سے مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس لیے وہ ان کے حضور (اگر وہ زندہ ہوں تو ان کی بارگاہ میں اور وفات پا چکے ہوں تو ان کے مزار پر پائمتی کی طرف سجدہ ریز ہو کر) روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، معافیاں مانگتا ہے کہ یا حضرت! مجھے بخش دیجئے، معاف کر دیجئے، ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ دین اور دنیا میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ سوچئے کہ کیا شرفِ انسانیت کی تذلیل کی اس سے فروتر کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے؟ لیکن شخصیت پرستی یہ سب کچھ کراتی ہے۔

قرآنِ کریم جو انقلاب دلوں کی بستیوں میں لایا، اس نے شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ خود حضور ﷺ رسالت مآب کا (زبانِ وحی کی رو سے) یہ ارشاد کہ: انا

بشر مثلکم (میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں) شخصیت پرستی کی جڑ پر تبر کی ضرب کاری کیلئے تھا۔ آپ نے اپنی زندگی میں اس کی جو مثالیں پیش کیں انہیں آپ سیرتِ طیبہ پر میری پیش کش' معراجِ انسانیت میں دیکھئے۔ لیکن میں اس وقت اس باب میں حضورﷺ کی سیرتِ اقدس کی کوئی مثال پیش کرنا نہیں چاہتا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضورﷺ نے اپنی تعلیم و تربیت سے اپنے متبعین میں قلبِ ماہیئت پیدا کر دی تھی اس سے ان حضرات کی کیفیت کیا ہو گئی تھی۔ (جیسا کہ قرآنِ کریم سے واضح ہے) نبی اکرمﷺ نے صلح حدیبیہ کے وقت ایک درخت کے نیچے صحابہؓ سے بیعت لی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور اس درخت کے نیچے خصوصیت سے نماز ادا کرتے ہیں۔ طبیعی آثار و مظاہر سے وابستگی محسوسات کے خوگر انسان کی گویا طبیعت میں داخل ہے۔ اگر یہ وابستگی دین کے کسی تقاضے سے نہ ٹکرائے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں ہوتا۔ بیعتِ رضوان کا درخت ایک فردوس بداماں واقعہ کی یاد تازہ کراتا تھا اور صحابہؓ اس کی پرستش نہیں کرتے تھے' محض اس کے نیچے نماز ادا کرتے تھے۔ نظر بظاہر اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔ لیکن اس دست پروردۂ نبوت کی نگاہِ حقیقت شناس اس معصوم سی ابتدا سے آنے والے خطرات کو بھانپ رہی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ غیر شعوری طور پر اس درخت کی عقیدت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو رہی ہے جو آگے چل کر خطرناک شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اس کا ایک ہی علاج تھا۔ اور وہ یہ کہ اس درخت کو جڑ سے کاٹ دیا جائے۔ علاج تو اس کا یہی تھا لیکن ایسا کرنے کیلئے اور تو اور خود اپنے جذبات کا بھی جس جرأت سے مقابلہ کرنا تھا' وہ ظاہر ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر دین کا تقاضا جذبات پر غالب نہ آ جاتا تو عمرؓ ابنِ خطاب' فاروقِ اعظمؓ کس طرح بن جاتا۔ چنانچہ آپ نے پوری ہمت اور جرأت سے فیصلہ کیا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے۔ درخت کٹ گیا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ:

''تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کے محسوس آثار کا اتباع شروع کر دیا اور اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں عبادت گاہیں بنا لیا''۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؓ نے یہ بھی فرمایا کہ: ''تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اس سے تم بت پرستی کی طرف لوٹ رہے ہو؟''۔

کیسی دوررس نگاہ تھی اس متعلم درس گاہِ نبویﷺ کی؟ آپ نے اس امکانی خطرہ کے پیشِ نظر اس درخت کو تو کٹوا دیا' لیکن آپ کو کیا خبر تھی کہ بعد میں یہ امت اس خطرہ کے بیجوں کی جھولیاں بھر بھر کر لے جائے گی اور انہیں ساری دنیا میں بکھیر دے گی کہ ایک ایک بیج سے سو سو پرستش گاہیں وجود میں آ جائیں گی۔ جہاں اس توحید کی مدعی امت کے سر اینٹوں اور پتھروں کے سامنے جھکیں گے۔ بہر حال' عمر فاروقؓ ان بعد میں آنے والوں کے اعمال کے ذمہ دار نہیں۔ انہوں نے آثارِ شرک کی جڑ کاٹ کر امت کیلئے ایک نظیر قائم کر دی تھی۔ لیکن جب امت نے قرآن ہی کو چھوڑ دیا تو اس قسم کے نظائر ان کیلئے کس طرح عبرت آموز ہو سکتے ہیں۔

عدل:

بات میں یہ کر رہا تھا کہ نظامِ الٰہی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محکومیت صرف قوانین الٰہی کی اختیار کی جاتی ہے۔ کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کی نہیں۔ لیکن یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ قانون خواہ کیسا ہی بلند و بالا ہو' اس کے انسانیت ساز نتائج اسی صورت میں برآمد ہو سکتے ہیں کہ اس قانون کو نافذ کرنے والے عدل کی میزان کو تھامے ہوئے ہوں۔ عدل کسے کہتے ہیں اسے قرآنِ کریم نے ان چار الفاظ میں منضبط کر کے سمجھا دیا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک عظیم رسول حضرت داؤدؑ کو مخاطب کر کہا تھا کہ: ''اے داؤد! ہم نے تمہیں ملک میں صاحبِ اقتدار اس لیے بنایا ہے کہ تم لوگوں کے امور کے فیصلے الحق (وحی الٰہی) کے مطابق کرو' اور ایسا کرنے میں اپنے جذبات' میلانات' خواہشات کا اتباع نہ کرنے لگ جاؤ'' (38:26)۔ لہٰذا عدل سے مراد یہ ہے کہ صاحبِ اقتدار قانون کے نفاذ میں اپنے رجحانات اور جذبات کو یکسر الگ رکھے اور انسان اور انسان میں کسی قسم کی تفریق اور تمیز نہ کرے۔ یہ ہے وہ بنیادی خصوصیات جس سے یہ نظام عدیم النظیر قرار پاتا ہے۔ جب اسلامی نظام قائم ہوا تھا تو قانون نافذ کرنے والے اپنے جذبات اور میلانات کو کس طرح الگ رکھتے تھے' کتب سیر و آثار میں اس کی مثالیں تو بے شمار ہیں لیکن قلتِ وقت کہ وجہ سے اس وقت صرف ایک پر اکتفا کر رہا ہوں۔

سیرتِ طیبہ کے ایک واقعہ کو لیجئے جو ہے تو مختصر سا لیکن اس میں قانون اور ذاتی جذبات کو نکھار کر الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ حضورﷺ کی انصاف پروری اور معدلت گستری اس قدر مسلم اور پر اعتماد تھی کہ یہودی بھی باوجود اس قدر مخالف ہونے کے اپنے اہم مقدمات حضورﷺ کی عدالت میں لایا کرتے تھے۔ آپﷺ نے قتل کے ایک مجرم کو موت کی سزا کا حکم سنایا۔ جلاد اس کے سر پر تلوار لیے کھڑا آخری اشارے کا منتظر تھا کہ اتنے میں اس مجرم کی ایک خوردسالہ بچی روتی' چیختی' چلاتی دوڑی دوڑی

آئی اور حضورﷺ کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ کر فریاد کی کہ مجھے یتیم ہونے سے بچا لیجئے۔ اس کی آہ وفغان اس قدر رقت آمیز تھی کہ حضورﷺ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ صحابہؓ نے سمجھا کہ آپﷺ سزائے موت کا حکم واپس لے لیں گے۔ لیکن آپﷺ نے بچی کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا اور جلاد کو قتل کا اشارہ دے دیا۔ بعد میں صحابہؓ نے پوچھا کہ آپﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس کے باوجود آپﷺ نے قتل کا حکم دے دیا۔ یہ متضاد کیفیت کیوں تھی؟ اس کے جواب میں آپﷺ نے جو فقرہ ارشاد فرمایا وہ تاریخ میں کلاسک کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپﷺ نے فرمایا کہ: ''اس وقت محمدﷺ بن عبداللہؐ کی آنکھ روتی تھی اور محمد رسول اللہﷺ کا ہاتھ اللہ کا قانون نافذ کر رہا تھا۔'' محمدﷺ بن عبداللہؐ اور محمد رسول اللہﷺ کا یہی وہ نازک فرق ہے جو قانون کی بالادستی کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے۔

خطباتِ خلافت:

حضورﷺ کی سیرتِ طیبہ تو اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے لیکن قلت وقت کے کے احساس سے مجھے آگے بڑھ جانا چاہئے اور اس فردوس بداماں داستان کے اگلے باب کی ابتداء حضرت صدیقِ اکبرؓ کے اس خطبے سے کرنی چاہئے جسے آپؓ نے منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے کے بعد ارشاد فرمایا۔ آپؓ نے کہا:

''اے لوگو! میں تمہارا سربراہ بنایا گیا ہوں لیکن میں تم سے بہتر نہیں۔ اگر صحیح کام کروں تو اس میں میری مدد کرو۔ اگر غلط قدم اٹھاؤں تو مجھے ٹوکو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے کمزور ترین شخص میرے نزدیک قوی تر ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں سے قوی تر آدمی میرے نزدیک کمزور تر ہے جب تک میں اس سے وہ حق نہ لے لوں جو اس کے ذمہ ہے'' (الخ)۔

حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت کا آغاز اس طرح فرمایا:

''لوگو! میں تم میں سے ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسولﷺ کی حکم عدولی گوارا ہو سکتی تو میں ہرگز یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔ میں اللہ سے تین دعائیں مانگتا ہوں۔ تم آمین کہو۔ پھر انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور نہایت عجز والحاح سے کہا: بارالٰہا! میں سخت ہوں مجھے حق کی موافقت، اپنی رضا طلبی اور احساسِ آخرت کیلئے نرم کر دے۔ یہ کہہ کر آپؓ خاموش ہو گئے۔ سامعین نے آمین کہا تو آپؓ نے بدراہِ رب العزت عرض کیا: یا اللہ! میں کمزور ہوں۔ مجھے قوی بنا دے تا کہ میں دین کے دشمنوں، منافقوں اور فحش کاروں کا مقابلہ کر سکوں۔ لیکن ایسا قوی نہیں کہ میں ان کے حق میں ظالم بن جاؤں اور ان پر دست درازی کرنے لگ جاؤں۔ آپؓ پھر خاموش ہو گئے۔ مجمع پر سناٹا چھا رہا تھا۔ لوگوں نے آمین کیا اور آپؓ نے تیسری دعا مانگی کہ: الٰہا العالمین! میں بخیل ہوں، مجھے امورِ خیر کیلئے سخی بنا دے۔ لیکن اس سخاوت میں ریاکاری کا شائبہ نہ ہو۔ مجمع پر سکوت چھا رہا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد آپؓ نے فرمایا: ایھا الناس! اللہ تعالیٰ نے میرے دور فقاء کے بعد مجھے تم میں باقی رکھا ہے تا کہ وہ میرے ذریعے تمہاری اور تمہارے ذریعے میری آزمائش کرے۔ میرے سامنے تمہارا جو معاملہ آئے گا میں اسے کسی دوسرے پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ خود سرانجام دوں گا۔ البتہ جو معاملہ ایسا ہو گا جس میں مجھے دوسروں کی معاونت کی ضرورت ہو گی تو اس کیلئے میں حتی الامکان ایسے لوگوں کو متعین کروں گا جن کی صداقت اور امانت میں شبہ نہ ہو۔ اگر وہ صحیح راستے پر چلیں گے تو میں ان کے ساتھ نیک سلوک کروں گا۔ اگر غلط رویہ اختیار کریں گے تو انہیں عبرتناک سزا دوں گا۔ اس کے بعد آپؓ نے سامعین سے کہا: قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہو گی اور اسی کے مطابق عمل کرو تا کہ تم عاملِ قرآن ہو جاؤ۔ اپنے آپ کا محاسبہ کرو اس سے پیشتر کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ قیامت کے دن کیلئے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں رہے گی۔ اس کے بعد آپؓ نے اپنے لیے وہ دعا مانگی جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ اس میں آپؓ نے کہا کہ: بارالٰہا! مجھے تفکر و تدبرِ قرآنی عطا فرما تا کہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔ تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جب تک زندہ رہوں تیری کتاب پر عمل پیرا رہوں''۔

ایک دوسرے خطبے میں جو اس سے زیادہ مفصل تھا آپؓ نے کہا:

اے لوگو! اب جبکہ تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری سختی نرمی میں بدل گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کیلئے بدستور قائم ہے جو ظلم اور زیادتی سے کام لیں۔ رہے وہ لوگ جو امن وسلامتی سے رہتے اور جرأت ایمانی رکھتے ہیں تو ان کیلئے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرے گا تو میں اسے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں رکھ دوں تا آنکہ وہ حق

کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔لیکن اس تمام سختی کے باوجود میں اہلِ حق کے لئے خود اپنے رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔لوگو! مجھ پر تمہارے کچھ حقوق ہیں جنہیں میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں تا کہ تم اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرلو:

1- تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے۔

2- تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ میں تمہارے وظائف میں اضافہ کوں۔(تا کہ تم خوشحالی کی زندگی بسر کرسکو) اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کروں (تا کہ تم بیرونی خطرات سے محفوظ ہو جاؤ)۔

3- تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ میں تمہیں خواہ مخواہ خطرات میں نہ ڈالوں۔تمہیں بلاضرورت گھر واپس آنے سے نہ روکوں۔اور جب تم کسی جنگ پر جاؤ تو باپ کی طرح تمہارے اہل وعیال کی حفاظت کروں۔ان کے مقابلے میں میرا تم پر صرف ایک حق ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ تمہیں عطا کرے اس میں سے اپنے لیے صرف اتنا لے لوں جو میری اور میرے بال بچوں کی ضروریات پورا کر سکے۔

تمہاری جو ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرتے رہو۔میں تم سے یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لیے اللہ سے حفاظت طلب کر رہا ہوں۔میں یوم الحساب کا منتظر ہوں جب مجھے یہ بتانا ہوگا کہ میں نے تم سے کیا لیا اور اسے کیسے خرچ کیا۔

قادسیہ کی عظیم فتح کے بعد آپؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا:

واللہ! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا غلام بنالوں۔میں تو خود اللہ تعالیٰ کا غلام ہوں۔اس نے میرے سپرد ایک امانت کر دی ہے۔اگر میں اسے اس طرح استعمال کروں کہ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں اور تمہیں گھر بیٹھے سیراب کر دوں تو میں سعادت مند ہوں اور اگر میں اس امانت کو اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں تو میں بہت بد بخت ہوں گا کہ چند دن عارضی طور پر خوش ہولوں اور پھر ابدی غم والم میرے حصے میں ہوں۔میں جانتا ہوں کہ اس خیانت کے جرم سے مجھے کبھی معافی نہیں مل سکے گی اور نہ میں واپس بھیجا جاؤں گا کہ تمہیں آ کر راضی کرلوں۔

خلیفہ یا بادشاہ:

یہ تھے نظامِ الٰہی قائم کرنے والوں کے عزائم ومقاصد اور یہ تھا انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس اور یہی احساس تھا جس کی بنا پر آپؓ نے ایک دن کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ؟ کیونکہ اگر بادشاہ ہوں تو اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے۔اس پر مجمع میں سے ایک شخص برجستہ بولا کہ ''خلافت اور شہنشاہیت میں بڑا فرق ہے۔خلیفہ عوام کے جملہ حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔وہ ہر انسان کا حق' حقدار کو دیتا ہے۔وہ ناجائز طور پر کسی سے کچھ لیتا ہے نہ ناجائز کچھ خرچ کرتا ہے۔اس کے برعکس بادشاہ زبردستی کرتا ہے۔ایک سے چھین کر دوسرے کو دیتا ہے۔للہ الحمد کہ آپؓ خلیفہ ہیں' بادشاہ نہیں ہیں۔اس پر آپؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؓ بدرگاہِ احکم الحاکمین سجدہ ریز ہو گئے۔